11

کچھ ذریعہ تعلیم کے بارے میں

اس سبق کی تدریس کے بعد طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

پڑھنا

- مفہوم برقرار رکھتے ہوئے متفرق طریقوں سے عبارت یا جملوں میں تبدیلی کرتے ہوئے انھیں مزید آگے بڑھا سکیں۔
- مختلف تحاریر (روداد، مضامین، سفرنامہ، خطوط، اداریے، خبریں، رپورٹ، اشتہار وغیرہ) پڑھ کر ان کے مقاصد کی ترجمانی کر سکیں۔
- پڑھے گئے متن کے کسی حصے کو دہراتے ہوئے حوالوں اور دلائل کے ساتھ اظہارِ رائے کر سکیں۔
- کسی بھی نثر پارے میں موضوعات کی شناخت کرتے ہوئے اس کی وضاحت کے لیے اپنی رائے کا اظہار کر سکیں۔
- لائبریری کی درجہ بندی اور فہرست کی ترتیب کو سمجھتے ہوئے اس کو استعمال کر سکیں۔

لکھنا

- مضمون نویسی کے مختلف اندازِ تحریر (بیانیہ، مدلل، بحثی اور تفصیلی) کو مدِنظر رکھتے ہوئے مختلف موضوعات کو قلم بند کر سکیں۔
- ہدایات اور اشارات کے مطابق کسی نادیدہ اقتباس کی تفہیم / تنقید و تجزیہ / تبصرہ کر سکیں۔

خاص	اَشیائے تعیُّش	اَندیشہ	آب یاری	تصفِیہ	تنوّع
الفاظ	رائے عامہ	ساقِط	غُنچی	گُڑگُڑی	مُشتقّات

ہدایات برائے اساتذہ کرام

- طلبہ کو قومی زبان کی اہمیت اور ضرورت سے آگاہ کریں۔ انھیں بتائیں کہ اردو ایک لشکری زبان ہے۔ اس میں نہ صرف عالمی زبانوں کے الفاظ موجود ہیں بلکہ مختلف علاقائی زبانوں کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔
- طلبہ کو سکول کی لائبریری لے کر جائیں اور اس کی درجہ بندی اور فہرست کی ترتیب کے متعلق سمجھائیں اور پھر تمام طلبہ کو باری باری اسے استعمال کرتے ہوئے کسی موضوع پر کوئی کتاب ڈھونڈنے کا کہیں۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (۱۹۱۶ء۔ ۱۹۹۴ء)

پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی؛ ماہرِ لسانیات، محقق، ماہرِ تعلیم، نقاد، جامعہ کراچی کے شعبہ اردو کے سربراہ اور کولمبیا یونی ورسٹی کے وزٹنگ پروفیسر تھے۔ ابواللیث صدیقی ۱۵ جون ۱۹۱۶ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے آگرہ، بدایوں اور علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔ وہ علی گڑھ یونی ورسٹی سے اردو ادب میں پی ایچ ڈی کرنے والے پہلے اسکالر تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۳ء میں دبستان لکھنؤ پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ابواللیث صدیقی ابتدا میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۸ء میں لندن اسکول آف ایشین اینڈ افریقن اسٹڈیز چلے گئے اور شمالی ہندوستان میں ہند آریائی زبانوں پر تحقیق کی۔ تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان چلے آئے۔ پہلے لاہور اور پھر کراچی میں سکونت اختیار کی۔ ابواللیث صدیقی؛ اورینٹل کالج لاہور اور جامعہ کراچی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہوئے اور اردو شعبہ کے سربراہ رہے۔ اسی دوران انھوں نے کچھ عرصے تک اردو لغت بورڈ کراچی کے مدیرِ اعلیٰ کی خدمات بھی سرانجام دیں۔ اہم تصانیف میں: لکھنؤ کا دبستان شاعری، کلیات مصحفی، غزل اور متغزلین، (۱۹۶۸ء)، آج کا اردو ادب (۱۹۷۵ء)، تاریخ زبان و ادبیات اردو، تاریخ اصول تنقید، جدید اردو ادبیات، جامع القواعد (حصہ صرف) ۱۹۷۱ء، رفت و بود (خود نوشت)، اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ (۱۹۸۱ء)، تجربے اور روایت (اکتوبر ۱۹۵۹ء)، مصحفی اور ان کا کلام، جرات: اس کا عہد اور شاعری نظیر اکبر آبادی: اس کا عہد اور شاعری، تاریخ زبان و ادب اردو اور بیسویں صدی کا اردو ادب شامل ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۷ ستمبر ۱۹۹۴ء کو کراچی میں وفات پا گئے اور جامعہ کراچی کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔

پڑھیں

پڑھنے سے پہلے پوچھیں

- ذریعۂ تعلیم سے کیا مراد ہے؟
- پاکستان میں ذریعۂ تعلم کس زبان میں ہونا چاہیے؟ اپنی رائے دیں

ذریعۂ تعلیم کے باب میں ہمارے ملک میں کوئی ڈیڑھ سو سال سے گفت گو ہو رہی ہے۔ دنیا کے شاید ہی کسی ملک میں کسی مسئلے کے تصفیے نے اتنا وقت لیا ہو اور بد قسمتی یہ ہے کہ ہم اب بھی اتنی مدت کے بعد کسی متفقہ فیصلے پر نہیں پہنچے۔ میں نے جو ڈیڑھ سو سال کہے ہیں تو یہ کوئی مبالغہ یا شاعرانہ بات نہیں ہے کیوں کہ خوش قسمتی یا بد قسمتی کہیے کہ میں شاعر نہیں ہوں اور نہ شعر میں مبالغہ پسند کرتا ہوں۔

جب تک فارسی اس ملک کی سرکاری اور دفتری زبان رہی یہی ہماری علمی اور ادبی زبان رہی لیکن اس کی حیثیت ایک اجنبی اور غیر ملکی زبان کی نہ تھی۔ فارسی یہاں کے لوگوں کے گھروں میں بولی جاتی تھی۔ بعض لوگوں کی مادری یا پدری زبان تھی اور یہاں کے لوگوں کی بھی یہ ثانوی زبان بن گئی تھی اور اتنی عام ہو گئی تھی کہ لوگ اس میں شعر کہتے تھے۔ دیوان اور مجموعے مرتب کرتے تھے۔ علمی ادبی اور تاریخی کتابیں لکھتے تھے جن کو نہ صرف اس ملک میں بلکہ ایران میں بھی اربابِ بصیرت سینے سے لگاتے اور آنکھوں پر رکھتے تھے۔ آخر امیر خسروؔ، عبدالقادر بیدلؔ، مرزا غالبؔ اور دورِ آخر میں اقبالؔ اسی ملک میں پیدا ہوئے تھے اور یہاں کی آب و ہوا میں پرورش پائی تھی اور ان کی فارسی اہلِ زبان کے نزدیک بھی ویسی ہی قابلِ قبول ہے۔ یہ بات میں نے اس لیے ذرا تفصیل سے کہی ہے کہ مدتوں تک فارسی ہماری تعلیم کا ذریعہ رہی بلکہ فارسی ہی کیا عربی بھی ہماری علمی زبان تھی اور اس کی تحصیل کے بغیر ہمارے عالم کا تصور مکمل نہیں ہوتا تھا لیکن فارسی کے اثر و اقتدار نے ایک عرصے تک اردو کی ترقی کو روکے رکھا اور ایک مدت تک یہ زبان صرف روزمرہ کے کاروبار اور معمولی کاموں کے لیے استعمال ہوتی رہی لیکن فارسی اپنی اس مقبولیت اور رواج کے باوصف اس ملک کی ملکی یا قومی زبان نہ بن سکی اور آہستہ آہستہ اردو کو ابھرنے اور ترقی کرنے کا موقع ملا۔ پہلے پہل صوفیائے کرام اور علمائے عظام نے اس کی طرف توجہ دی اور اسے برصغیر ہندوپاکستان میں تبلیغِ دین کا ذریعہ اور وسیلہ بنایا اور پھر اپنی تعلیمات سے مریدوں کی تربیت اور تصنیف و تالیف میں اختیار کیا۔ رفتہ رفتہ اس نے فارسی کے مقابلے میں آنکھیں کھولیں۔ دکنی درباروں میں اسے سلاطین اور امرا کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ شعرا اور نثر نگاروں نے اپنے افکار اور خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اس میں الفاظ کا سرمایا بڑھا۔ اسالیب پیدا ہوئے اور تھوڑے دنوں میں یہ فارسی کی جانشین بن گئی۔ فارسی سے اس کی دشمنی نہ تھی۔ اس نے فارسی سے بہت کچھ سیکھا۔ فارسی کے پروں سے پرواز کی۔ فارسی نے اس کی آب یاری کی۔ اسے موضوعات اور اسالیب کے تنوع اور پختگی سے آشنا کرایا اور اس قابل بنا دیا کہ یہ اپنے دور کے علمی اور ادبی تقاضوں کو پورا کر سکے۔

بد قسمتی سے اس دور کا آغاز ایک نئے سیاسی انقلاب سے ہوا جس نے فارسی کی جگہ انگریزی کو اس کا حریف بنا کر کھڑا کیا۔ یہ حریف بڑا سخت تھا۔ انگریزی کی حیثیت اس ملک میں فارسی سے بالکل مختلف تھی۔ اردو بولنے والوں کی تہذیب اور کلچر کو بھی فارسی نے سنوارا تھا۔ ان دونوں میں ایک تہذیبی اور ثقافتی یگانگت تھی۔ یہ بات انگریزی کو کہاں نصیب تھی؟ یہی وجہ ہوئی کہ سیاسی تسلط اور اقتدار نے انگریزی کو دفتروں، درباروں، کاروبار اور تعلیم میں تو داخل کر دیا لیکن یہ اردو بولنے والوں کے دلوں میں گھر نہ کر سکی۔ وہ ان کے جذبات و احساسات کی ترجمان نہ بن سکی۔ اس میں ان کی محبت کے گیت نہ گائے جا سکے اور نہ یہ زبان ان کی مسرتوں اور شادمانیوں، کامرانیوں اور ناکامیوں کے اظہار کا وسیلہ بن سکی۔ اس کی مثال اس کائی کی طرح تھی جو صاف شفاف پانی کی سطح کو تو پوری طرح ڈھک لیتی ہے لیکن اس کی جڑیں زیادہ دُور تک نہیں پہنچتیں۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو انگریزی شاعری، انگریزی ادب اور انگریزی زبان کی تاریخ میں کوئی تو ایسا نام ملتا جو فارسی کے خسروؔ، بیدلؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کی طرح اہلِ زبان میں مقبول ہوتا۔

مصیبت یہ ہوئی کہ ہم انگریزی کو نہ اپنا سکے اور انگریزوں کا اقبال اس ملک سے رخصت ہوا۔ بلکہ سچ تو یوں کہنا چاہیے کہ انگریز رخصت ہوئے مگر اپنا اقبال چھوڑ گئے کہ ہم اب تک اپنے آپ کو اس ذہنی غلامی سے آزاد نہ کرا سکے جس میں انھوں نے ہمیں دو سو سال تک مبتلا کر دیا۔ خیر یہ کوئی بات نہ ہوتی اگر انگریزی نے ہمیں کم از کم اس قابل بنا دیا ہوتا کہ کسی اعتبار سے ہم دنیا کی کسی ترقی یافتہ قوم سے آنکھیں ملا سکیں۔ دو سو سال تک انگریزی پڑھنے اور انگریزی کے ذریعے سے علوم و فنون حاصل کرنے کی سعی لاحاصل کے باوجود آج بھی یہ ملک مغربی ممالک تو کیا اپنے چھوٹے چھوٹے ہم سایہ ملکوں کے مقابلے میں جاہل رہ گیا۔ جاپان ایشیائی ملک ہے جس نے ایشیا کی لاج رکھ لی۔ آج دنیا میں خواندگی کے اعتبار سے جاپان کا نام سر فہرست ہے۔ آج ہمارا ملک دنیا کا واحد ملک ہے جو یہ کہتا ہے کہ ہمیں اپنی زبان میں تعلیم نہیں چاہیے۔ ہماری زبان اس قابل نہیں کہ اس میں جدید علوم و فنون پڑھائے جا سکیں۔ آج بھی ہمارے بہت سے نادان دوست کہتے ہیں کہ اگر اس قوم نے انگریزی زبان کا سایۂ عاطفت چھوڑا تو یہ قوم یتیم ہو جائے گی، جاہل رہ جائے گی، دنیا میں کوئی اس کی بات نہ پوچھے گا، بین الاقوامی حلقوں میں اس کا اعتبار ساقط ہو جائے گا۔ انگریزی کو چھوڑ کر یہ قوم ذہنی اعتبار سے مفلس ہو جائے گی۔ علوم و فنون کا جو ذخیرہ انگریزی میں ہے اور اس میں روز بہ روز جو اضافہ ہو رہا ہے یہ قوم اس سے محروم رہ جائے گی۔

ہمارے محبانِ قوم کا ایک طبقہ اور ہے جسے اپنی زبان سے بھی ہم دردی ہے اور جس پر انگریزی اور انگریز کے اقبال کا سایہ بھی ذرا ہلکا پڑتا ہے۔ یہ لوگ اصولاً تو تسلیم کرتے ہیں کہ قومی ترقی کے لیے قومی زبان کی ترقی ضروری ہوتی ہے اور ملک میں تعلیم و تدریس کے معیار کو اعلیٰ کرنے کے لیے قومی زبان میں تعلیم ہونی چاہیے لیکن ان کے خیال میں اردو بھی اس قابل نہیں ہوئی کہ اسے یہ منصب سونپا جائے۔ اس میں علمی اور فنی اصطلاحات کی کمی ہے۔ اس میں سائنسی مضامین کو ادا کرنے کا اسلوب پیدا نہیں ہوا ہے۔ جدید علوم و فنون پر کتابوں کا ذخیرہ موجود نہیں ہے۔ ایسے استاد موجود نہیں ہیں جو اپنی زبان میں کسی علم کو پڑھا سکیں۔ اردو میں طباعت اور اشاعت کی دقتیں ہیں غرض ان کے خیال میں بھی وہ وقت نہیں آیا کہ اپنی زبانوں میں تعلیم دینے کے مسئلے کو اٹھایا جائے۔

ان سوالوں کا جواب ایک بار نہیں ہزار بار دیا جا چکا ہے اور ان لوگوں نے دیا ہے جو اس زبان اور اس کے سرمائے سے واقف ہیں۔ ان لوگوں نے دیا ہے جو جدید علوم و فنون سے بھی واقف ہیں اور جنھوں نے اپنی تعلیم انگریزی ہی کے ذریعے سے حاصل کی ہے اور جو اس مسئلے کی قومی اور بین الاقوامی حیثیت کے پہلوؤں پر غور کرنے میں اپنی عمریں گزار چکے ہیں لیکن ہر مرتبہ یہ مسائل اس طرح اٹھائے جاتے ہیں۔ گویا پہلی مرتبہ ان کا اظہار ہو رہا ہے اور ان کا کوئی جواب ہمارے پاس نہیں۔ بہ ہر حال میں ان ہی چند مفروضہ مسائل اور خدشات کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ جن قوموں نے سائنسی میدان میں ترقی کی ہے، کیا واقعی ان کی یہ ترقی انگریزی زبان کی مرہونِ منت ہے۔ مثال کے طور پر یورپ میں جرمنی کو یا پھر روس کو یا پھر ایشیا میں جاپان کو لے لیجیے۔ ان ملکوں کی سائنسی ترقی اور صنعتی فروغ کوئی ایسی بات نہیں جس پر کوئی بحث ہو سکے اور ان سب ملکوں نے اپنی اپنی زبان میں سائنس کی تعلیم و تدریس سے یہ ترقی کی ہے اور آج بھی سائنسی لٹریچر جتنا ان زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ انگریزی میں شائع ہونے والے لٹریچر سے مقدار یا نوعیت میں کسی اعتبار سے کم نہیں ہے تو اگر دنیا کے اور چھوٹے بڑے مختلف ممالک اپنی اپنی زبانوں میں جملہ علوم و فنون اور سائنسی صنعتی اور تکنیکی تعلیم کا انتظام کر سکتے ہیں تو ہماری زبان میں ایسی کیا بنیادی کم زوری اور خامی ہے جس کی بنا پر یہ ہماری تعلیم اور بالخصوص سائنسی تعلیم کا ذریعہ نہیں بن سکی۔ بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ انگریزی زبان میں اس قدر وسعت اور صلاحیت ہے کہ وہ سائنسی علوم کی تیز رفتار ترقی کا ساتھ دے سکتی ہے اور بے چاری اُردو، اِن صلاحیتوں سے محروم ہے یعنی انگریزی میں اصطلاحات اور مشتقات آسانی سے بن جاتے ہیں اور اُردو میں اتنی آسانی سے دست یاب نہیں ہو سکتے۔ یہ بات وہی کہ سکتا ہے جو انگریزی اور اردو کی اصل سے واقف نہ ہو۔ زبان کی تاریخ کے معمولی طالب علم بھی اتنی بات جانتے ہیں کہ انگریزی اور اُردو، دونوں ایک آریائی خاندان کی زبانیں ہیں۔ اصولِ ساخت، بنیادی قواعد، مشتقات کے

اصولوں میں دونوں میں بڑا اشتراک پایا جاتا ہے۔ دونوں میں مشتقات، سابقوں اور لاحقوں کی ایک لامحدود تعداد کے اضافوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ دونوں میں مرکب الفاظ بنانے کے تقریباً ایک سے اصول ہیں۔ انگریزی اپنے پھیلاؤ کے اس عمل میں یونانی اور لاطینی کی مدد لیتی ہے۔

اردو کے لیے فارسی، عربی اور بے شمار زبانوں کے ماخذ کھلے ہوئے ہیں۔ دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی زبان ہو جو اس باب میں اُردو کا مقابلہ کر سکے۔ اس میں نئے الفاظ کے قبول کرنے کی بڑی صلاحیت ہے اور اپنی ساخت اور مزاج کے باعث غیر زبانوں کے الفاظ اور اصطلاحات بھی اس میں بلا تکلف گھل مل جاتے ہیں۔ اس لیے اگر اسے جدید علوم و فنون کی تعلیم اور تدریس کے لیے اختیار کیا جائے تو یہ اس فرض کو ادا کر سکتی ہے۔ الفاظ یا اصطلاحات تو خیالات کے تابع ہوتے ہیں اور خیالات اور تصورات کے اظہار کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ زبان کی ترقی کی جس منزل میں جس قسم کے خیالات کے اظہار کی ضرورت ہوتی ہے اس قسم کے الفاظ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ الفاظ پہلے پیدا ہو جائیں اور ان سے کام بعد میں لیا جائے۔ اگر آج سے سو سال قبل کلی طور پر اردو کو سائنسی علوم کی تعلیم و تدریس کا ذریعہ بنا لیا جاتا تو اس عرصے میں ہزاروں الفاظ اور اصطلاحات پیدا ہو گئی ہوتیں۔

اس سلسلے میں ایک اور مسئلہ اصطلاحاتِ علمیہ کا اٹھایا جاتا ہے۔ بلاشبہ علمی زبان بڑی حد تک اصطلاحی زبان ہوتی ہے لیکن یہ اصطلاحات علمی ترقی کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتی ہیں جن ملکوں نے سائنسی علوم میں نمایاں ترقی کی ہے۔ ان میں سے کسی میں یہ نہیں ہوا کہ پہلے سارے علوم کی اصطلاحات بنائی گئی ہوں اور پھر ان علوم پر کتابیں مضامین یا مقالات لکھے گئے ہوں۔

اردو کے لیے علاوہ ان ہندوستانی اور پاکستانی زبانوں اور بولیوں کے جن سے اس کا قریبی رشتہ ہے۔ فارسی اور عربی دو نہایت اہم ماخذ ہیں جن کے عناصر اور اجزا اردو کی ترکیب میں شامل ہیں اور آج بھی اصطلاح سازی میں کام آتے ہیں لیکن یہ خیال کہ پہلے ساری اصطلاحات کا ذخیرہ جمع ہو جائے۔ پھر کتابیں لکھی جائیں۔ تب جا کر اسے ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ بالکل گھوڑے کے آگے گاڑی جوتنے کے مترادف ہے۔ اصطلاح سازی کا کام اس طرح نہیں ہوتا اور ہم مدتوں سے یہ تجربہ کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس آج اصطلاح سازی کے لیے وہ ذرائع اور وسائل نہیں جو آج سے چالیس پچاس سال پہلے حیدر آباد میں دارالترجمہ" کے لیے مہیا کیے گئے تھے۔ دارالترجمہ نے بڑا مفید کام کیا۔ لیکن یہ کام وہ بھی مکمل نہ کر سکا اور نہ کر سکتا اور نہ آج کوئی ادارہ کر سکتا ہے اور حیدر آباد کی جو بے شمار اصطلاحیں رائج اور قبول ہو گئیں۔ وہ اس وجہ سے کہ وہاں ان کو کتابوں، مقالوں اور مضامین میں استعمال کیا گیا اور ان کو تعلیم میں اختیار کیا گیا۔

اس سلسلے میں ایک اور مسئلہ تراجم کا ہے۔ بلاشبہ ہر زبان کی ترقی میں دوسری زبانوں کے تراجم کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ بالخصوص اپنی نشوونما کے ابتدائی ادوار میں ترجموں ہی کے ذریعے سے مختلف موضوعات مضامین اور مباحث اور مختلف اسالیب بیان زبان میں پیدا ہوتے ہیں۔ اردو نے اپنی ترقی کے آغاز میں فارسی سے بہت کچھ سیکھا اور فارسی نظم و نثر کے اکثر شاہ کار اردو میں منتقل ہوئے۔ انگریزی سے بھی بہت ترجمے ہوئے۔ کچھ ترجمے فرانسیسی اور روسی بھی ہوئے اور کچھ اور مختلف زبانوں سے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی فارسی اور انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی کتابوں اور مضامین کا اردو ترقی میں بڑا حصہ ہے۔

علمی اور فنی کتابوں کی کمی کا مسئلہ ایک شیطانی چکر ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اردو میں علمی اور فنی کتابوں کی بہت کمی ہے اور اکثر مضامین اور موضوعات پر تو تلاش کے بعد بھی قابلِ مطالعہ چیزیں دست یاب نہیں ہوتیں اور بلاشبہ انگریزی اور بعض دوسری زبانوں میں اس قسم کی کتابیں تصانیف، تالیفات، مقالات، تراجم بہ کثرت مل جاتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ ان زبانوں میں لکھنے والے سائنس دانوں نے اپنی زبانوں کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان میں سے کوئی زبان ایسی نہیں جس میں پہلے پہل ان علوم کی کتابیں آسمان سے نازل ہوئی ہوں اور ان کو پڑھ کر سائنس دان اس قابل ہوئے ہوں کہ اپنے خیالات ان زبانوں میں ادا کر سکیں۔ ہر چیز کی فراہمی اس کی طلب یا مانگ پر منحصر ہوتی ہے۔ معاشیات کا یہ سادہ سا قانون صرف روئی کپڑے یا اشیائے

تعیش کی فراہمی کے مسئلے سے متعلق نہیں ہے۔ کتابوں اور سائنس دانوں کی فراہمی بھی اسی مسئلے کے تابع ہے۔ سائنس کی کتابوں کے طلب گار نہ تھے۔ مدرسوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں ان کے پڑھنے والے نہ تھے تو مصنف کیوں لکھتے اور ناشر اردو میں ان موضوعات پر کتابیں کیوں چھاپتے۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟؟ پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں ضروریات کا تعین کرنا چاہیے۔ مثلاً پاکستان کے مختلف ثانوی تعلیمی بورڈوں اور یونی ورسٹیوں کے نصاباتِ تعلیم کو سامنے رکھ کر ایک مفصل فہرست ان موضوعات کی تیار کرنا چاہیے جن کے لیے ہمیں کتابوں کی ضرورت ہے پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ موضوعات پر اب تک اردو میں کیا کیا لکھا جا چکا ہے؟؟ اس طرح مضامین اور مقالات اور کتابوں کی ایک مکمل کتابیات تیار ہو جائے گی۔ اصطلاحات کے بے شمار مجموعے شائع ہوئے ہیں اور اکثر کتابوں کے آخر میں مصنفین اور مؤلفین نے اصطلاحات کی فہرستیں بھی شامل کی ہیں۔ ان سب کی بھی ایک فہرست بنانی چاہیے۔ اس طرح ہمیں واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ کن مباحث و موضوعات پر کس سطح کی کتنی کتابیں موجود ہیں اور کہاں کہاں کس حد تک کمی ہے۔ پھر اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ایک منصوبہ تیار ہونا چاہیے جس میں بہ تدریج کتابیں لکھی جائیں۔ اردو کی ترقی کے لیے اس وقت بہت سے ادارے ہیں۔ مثلاً مرکزی ترقی اردو بورڈ لاہور، ترقی اردو بورڈ کراچی، انجمن ترقی اردو، اردو اکادمی پنجاب اور کراچی یونی ورسٹی میں ترجمے اور تالیف کے ادارے وغیرہ۔ ان کے علاوہ درسی کتابوں کی تالیف و تصنیف کے لیے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی مدارج کی حد تک مغربی پاکستان کا ٹیکسٹ بک بورڈ ہے۔ (۱۹۷۱ء سے قبل موجودہ پاکستان کو مغربی پاکستان کہا جاتا تھا) ان سب میں تعاون اور اشتراک عمل کے لیے تقسیم کار ہونا چاہیے اور کسی ایک مرکزی ادارے کو یہ خدمت انجام دینا چاہیے۔ حال میں مرکزی ترقی اُردو بورڈ لاہور نے علمی اور سائنسی اصلاحات کے معیاری بنانے کے لیے اس قسم کی ایک تجویز منظور بھی کی ہے جس کے مطابق مختلف اداروں کے علم میں ہم آہنگی اور اشتراک پیدا کیا جائے گا۔ توقع کی جاتی ہے کہ یہ طریق کار بہتر اور مفید نتائج پیدا کرے گا۔

ایک اور اہم تجویز یہ ہے کہ ان اداروں میں سے کوئی ادارہ ایک قسم کے مرکزی دفتر اطلاعات کا کام کرے یعنی مختلف مضامین پر اردو میں کتابوں، مقالوں، مضامین، اصطلاحات کی فہرستوں وغیرہ کی نشان دہی کر سکے اور ہو سکے تو یہ ادارہ ایک سہ ماہی اطلاع نامہ شائع کیا کرے تاکہ معلوم ہو سکے کہ مختلف ادارے یا افراد کیا کام کر رہے ہیں تاکہ ضرورت مند لوگ ان سے رجوع کر سکیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ لاعلمی کی بنا پر کام کی تکرار کا اندیشہ نہیں رہے گا اور جو کام ایک شخص یا ادارہ کر رہا ہے دوسرا اس کے علاوہ کوئی اور موضوع اختیار کرے گا۔ محدود ماہرین کی تعداد اور فنی وسائل نیز مالی ذرائع کی کمی کے پیشِ نظر اس کی اور بھی ضرورت ہے۔

اس پورے منصوبے کی تکمیل کے لیے یہ ضروری ہے کہ خود زبان کی تعلیم و تدریس پر بھی پوری توجہ صرف کی جائے کیوں کہ بالآخر اس منصوبے کی کامیابی اور زبان کی ترقی اور صلاحیت پر ہے۔ اس وقت تک ہمارے یہاں زبان کی تعلیم و تدریس بڑی حد تک صرف ادب کی تعلیم اور تنقید تک محدود ہے لیکن یہ زبان کی تعلیم کا صرف ایک حصہ ہے۔

ایک متبادل تجویز یہ ہے کہ ہم اپنے موجودہ نصابِ تعلیم میں جہاں زبان، ادب اور تنقید کی تعلیم و تدریس ہوتی ہے۔ وہاں ایک متبادل لسانیاتی مطالعے کو شامل کر دیں اور اس کی ایک صورت مثلاً: یہ ہو سکتی ہے کہ ایم۔ اے کے سالِ اول میں سب طلبہ ایک مشترک نصاب پڑھیں اور سالِ آخر میں جو طلبہ ادب اور تنقید کی طرف راغب ہوں وہ ادب اور تنقید کا نصاب اختیار کریں جو لسانیاتی مطالعے کی طرف مائل ہوں ان کے لیے متبادل لسانیاتی نصاب ہو۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں زبان کے معاملے میں جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ زبان تو جذبات کے ہی اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ ہم اپنے جذبات اپنی زبان سے کیسے الگ کر سکتے ہیں؟ ہاں ایک بات البتہ صحیح ہے کہ کوئی تعمیری کام محض جذبے سے یا محض نعرے سے انجام نہیں پا سکتا۔ ان مسائل کا حل بھی صرف جذباتی باتوں سے تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے جو لوگ ایمان داری کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ قومی زندگی میں قومی زبان کی کیا اہمیت ہوتی ہے انھیں خلوص کے ساتھ اس کی تعمیر میں اور ترقی میں حصہ لینا چاہیے۔ یہ کام صرف

چند ادارے پورا نہیں کر سکتے نہ محض حکومت کی اعانت اور سرپرستی ان مسائل کو حل کر سکتی ہے۔ یہ مسئلہ اسی طرح حل ہو سکتا ہے کہ اسے ایک قومی تحریک کی طرح چلایا جائے۔ اس کے لیے رائے عامہ تیار کی جائے۔ اس کے جواز کے لیے ہمارے اساتذہ، طلبہ، مصنفین، مؤلفین، ناشر، تعلیمی حکام، ہمارے صنعتی اور کاروباری ادارے؛ غرض ہماری قومی زندگی کا شعور رکھنے والا ہر شخص اپنی اپنی جگہ اس کی کام یابی میں حصہ لے۔ (ماہنامہ "سیپ")

مشق

پڑھنا

۱۔ (الف) سبق کو مکمل پڑھ کر درج ذیل عبارت کا مفہوم برقرار رکھ کر متفرق طریقوں سے عبارت یا جملوں میں تبدیلیاں کریں۔ عبارت کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کریں کہ اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دینے میں کون کون سے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور ان مسائل کا حل کیا ہے؟

(ب)۔ سبق "کچھ ذریعۂ تعلیم کے بارے میں" پڑھنے کے بعد اس میں موجود کم از کم دو سے تین موضوعات کی شناخت کر کے اپنی رائے کا تحریری/ زبانی اظہار کریں کہ مضمون نگار نے کس حد تک اردو کو پاکستان کا ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے مدلل نکات تحریر کیے ہیں؟

۲۔ اتوار کے دن کسی اخبار کا میگزین پڑھیں اور اس میں درج رُوداد، اداریے اور اشتہارات کا مطالعہ کریں۔ ان تحاریر کو پڑھ کر ان کے مقاصد کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک پیراگراف لکھیں جس میں یہ بتایا گیا ہو کہ کون سی رُوداد/اداریہ/اشتہار زندگی کے کس شعبے/پہلو کی نمائندگی کر رہا ہے؟

۳۔ پڑھے گئے اس سبق کے متن کے درج ذیل حصے کو دہراتے ہوئے حوالوں اور دلائل کے ساتھ اپنی رائے کا تحریری/زبانی اظہار کریں۔

اس سلسلے میں ایک اور مسئلہ تراجم کا ہے۔ بلاشبہ ہر زبان کی ترقی میں دوسری زبانوں کے تراجم کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ بالخصوص اپنی نشوونما کے ابتدائی ادوار میں ترجموں ہی کے ذریعہ سے مختلف موضوعات مضامین اور مباحث اور مختلف اسالیبِ بیان زبان میں پیدا ہوتے ہیں۔ اردو نے اپنی ترقی کے آغاز میں فارسی سے بہت کچھ سیکھا اور فارسی نظم و نثر کے اکثر شاہ کار اردو میں منتقل ہوئے۔ انگریزی سے بھی بہت ترجمے ہوئے۔ کچھ ترجمے فرانسیسی اور روسی بھی ہوئے اور کچھ اور مختلف زبانوں سے۔ لیکن بہ حیثیتِ مجموعی فارسی اور انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی کتابوں اور مضامین کا اردو ترقی میں بڑا حصہ ہے۔

۴۔ لائبریری کی درجہ بندی اور فہرست کی شناخت

استادِ محترم/استانی صاحبہ کی رہ نمائی میں طلبہ پانچ پانچ کے گروہوں کی صورت میں اپنے سکول کی لائبریری میں جائیں۔ لائبریری میں موجود پریم چند، سعادت حسن منٹو، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، شوکت صدیقی، الطاف فاطمہ، ممتاز مفتی، اور بانو قدسیہ کے افسانوں اور ڈراموں کے مجموعوں کی درجہ بندی اور فہرست کی ترتیب کو لائبریرین سے سمجھیں اس کا استعمال کرتے ہوئے اپنی اپنی پسند کی کوئی ایک کتاب تلاش کر کے جاری کرائیں اور اس کا مطالعہ کریں۔

لکھنا

مضمون نگاری

اردو نثر میں مضمون کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ کسی موضوع پر اپنے افکار و خیالات اور جذبات کو مربوط اور مدلل انداز میں لکھنا اور اپنی رائے کا اظہار کرنا مضمون نویسی کہلاتا ہے۔ مضمون لکھتے وقت کچھ اصول و ضوابط کا خیال رکھنا پڑتا ہے جن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی، سنجیدہ یا مزاحیہ موضوعات کو احاطۂ تحریر میں لایا جا سکتا ہے۔ مضمون تین حصوں پر مشتمل ہوتا ہے:

(i)۔ تمہید یا تعارف (ii)۔ اصل مضمون/نفسِ مضمون/متن (iii)۔ اختتام یا ذاتی رائے

مضمون کئی زاویوں اور انداز سے لکھا جا سکتا ہے۔ دلیل والا مضمون؛ تحقیقاتی مواد، اعداد و شمار اور مضمون نگار کی ذاتی رائے پر مشتمل ہوگا۔ بڑے پیمانے پر کی گئی تحقیقات پر مشتمل مضمون میں زبان سیدھی سادی زبان استعمال ہوتی ہے۔

وضاحتی مضمون میں کسی موضوع پر وضاحت کے ساتھ غیر جانب داری کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ وضاحتی مضمون کا مقصد کسی موضوع پر رائے بنائے بغیر اس کا تجزیہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ کسی خاص شعبے میں مضمون نگار کی مہارت کا اظہار ہوتا ہے۔

تقابلی مضمون دو پہلوؤں پر بحث کرتا ہے، مماثلت اور فرق کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ اس مضمون میں ایک پیراگراف مماثلت اور ایک پیراگراف اختلاف پر بحث کے لیے مختص کیا جاتا ہے۔ وجہ اور اثر بتایا جاتا ہے کہ چیزیں اس طرح کیوں ہیں؛ وہ کیسے وقوع پذیر ہوئیں؛ اور آگے کیا ہوگا۔ اس قسم کا مضمون لکھتے وقت واقعات کے دو مجموعوں کے درمیان ایک منطقی تعلق پیدا کیا جاتا ہے۔

بیانیہ مضمون ایک کہانی بتاتا ہے اور عمومی طور پر ذاتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ یہ مضمون باہمی تجربے کو پھیلانے کے لیے رقم کیا جاتا ہے۔ اس مضمون نے مختلف قسم کے چیلنجز کی کھوج لگانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

وضاحتی مضمون ایک مختصر قسم کا مضمون ہوتا ہے اور عام طور پر ایک صفحے کو محیط ہوتا ہے۔ جہاں ادب، کتاب، ناول، افسانے، ڈرامے یا شاعری کی وضاحت کی جاتی ہے۔ جب کہ تفصیلی مضمون میں کسی بھی موضوع پر حتی المقدور تمام تفصیلات لکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان تفصیلات کو مختلف پیراگرافوں میں ایک مربوط انداز میں تحریر کیا جاتا ہے۔

بحثی مضمون میں مضمون نگار اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ موضوع کے دو مقامات، پہلوؤں اور زاویوں سے آگاہ ہے۔

۵۔ درج بالا عبارت میں مضمون نویسی کے حوالے سے دی گئی معلومات، اشارات اور ہدایات کی تفہیم / تنقید و تجزیہ / تبصرہ کریں۔

۶۔ مضمون نویسی کے مختلف انداز تحریر (بیانیہ، مدلل، بحثی اور تفصیلی) کو مد نظر رکھتے ہوئے درج ذیل موضوعات پر مضمون لکھیں۔

(i)۔ میرا پسندیدہ شاعر (تفصیلی)
(ii)۔ ایک میچ کا آنکھوں دیکھا حال (بیانیہ)
(iii)۔ سوشل میڈیا۔ اخلاقی بگاڑ کی ایک وجہ (بحثی)
(iv)۔ کمپیوٹر ایک حیرت انگیز ایجاد (مدلل)

سرگرمی

سکول میں جماعت ہشتم تا دہم کے بیس سے پچیس طلبہ کی رائے کا سروے کریں کہ وہ پاکستان میں ذریعۂ تعلیم اردو زبان میں چاہتے ہیں کہ انگریزی میں؟ یہ ساری معلومات اکٹھی کر کے ایک رپورٹ تیار کریں اور اپنی رائے کے ساتھ اپنے استاد محترم / استانی صاحبہ کی خدمت میں پیش کریں تاکہ اس رپورٹ کو سکول کے میگزین میں شائع کیا جا سکے۔